9

اپریل 2014ء / جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ

ترتیب وتدوین
مولانا ابو حماد عبد الوحید اشرفی

مجلس مشاورت
مولانا محمد عابد • محمد ہاشم تہامی ایڈووکیٹ
محمد عرفان شجاع • حافظ محمد ابوبکر فہیم الدین

ملنے کے پتے

دار القرآن والترتیل
14-لٹن روڈ مزنگ لاہور

دار العلوم حسینیہ
صوفیہ آباد لاہور

مکتبہ قاسمیہ
الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور

صفہ ٹرسٹ
موہنی روڈ لاہور

مکتبہ الحسن
اردو بازار لاہور

قاری خالد محمود
کیپٹن جمال روڈ سانده کلاں

اقرأ کمپنی
غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور

دار الکتاب
غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور

الفلاح ایڈورٹائزر
اردو بازار لاہور

مکتبہ زکریا
اردو بازار لاہور

رابطے کے لیے
0321-4044602,0344-4445065,0331-0070580

شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

خصائص سیرت پر ایک نظر

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری

علم وعمل کی دنیا میں عظیم الشان شخصیت کے ناموں کے ساتھ مختلف خصائص وکمالات کی تصویریں ذہن کے پردے پر نمایاں ہوتی ہیں، لیکن شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کا نام زبان پر آتا ہے تو ایک کامل درجے کی اسلامی زندگی اپنے ذہن وفکر، علم وعمل اور اخلاق وسیرت کے تمام خصائص وکمالات اور محاسن ومحامد کے ساتھ تصور میں ابھرتی اور ذہن کے پردوں پر نقش ہوجاتی ہے۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اسلامی زندگی کیا ہوتی ہے؟ تو میں پورے یقین اور قلب کے کامل اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حسین احمد مدنیؒ کی زندگی کو دیکھ لیجئے اگرچہ یہ ایک قطعی اور آخری جواب ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ اس جواب کو علمی جواب تسلیم نہیں کیا جائے گا اور ان حضرات کا قلب اس جواب سے مطمئن نہیں ہوسکتا، جنہوں نے اپنی دور افتادگی وعدم مطالعہ کی وجہ سے یا قریب ہوکر بھی اپنی غفلت کی وجہ سے، یا اس وجہ سے کہ کسی خاص وذوق ومسلک کے شغف وانہماک، یا بعض تعصّبات نے ان کی نظروں کے آگے پردے ڈال دیئے تھے اور وہ حسین احمد کے فکر کی رفعتوں، سیرت کی دل ربائیوں اور علم وعمل کی جامعیت کبریٰ کو محسوس نہ کرسکے تھے اور ان کے مقام کی بلندیوں کا اندازہ نہ لگا سکے تھے۔ اس لیے ضروری ہوگیا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے فکر اور سیرت کے بعض خصائص کی طرف قارئین کرام کو توجہ دلاؤں۔

جامعیت علوم وفنون:

حضرت شیخ الاسلام ایک بلند پایہ عالم دین تھے۔ وہ اپنے دور کے بے مثال محدث تھے درس وتدریس اور تحقیق حدیث میں ان کا پایہ بہت بلند تھا تدریس حدیث میں ان کا ایک خاص اسلوب تھا جس نے انہیں اقران وامثال میں امتیاز بخشا تھا وہ بہت بڑے فقیہ تھے اور انہیں نہ صرف فقہ کے مسائل ازبر تھے بلکہ فقہ وحدیث میں ان کا درجہ ایک محقق اور مجتہد کا تھا وہ مفسر بھی تھے اور نہ صرف حروف وسواد کی رہنمائی میں بلکہ معانی کی گہرائی میں اتر کر قرآن کے بصائر وحکم اور مسائل واحکام کی تشریح وتفسیر فرماتے تھے وہ ایک زاہد شب زندہ دار بزرگ اور اپنے وقت کے ایک عظیم الشان شیخ طریقت تھے انہیں انسان کے امراض نفس وقلب کا پتا چلانے میں حذاقت کا کمال حاصل تھا معالجہ نفس وطبائع اور اصلاح وتزکیہ میں انہیں ید طولیٰ ملا تھا۔ تاریخ عالم میں ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور تاریخ معاشیات ہند کے وہ ایک عظیم اسکالر تھے بحر سیاسات ہند وانقلابات عالم اسلامی کے وہ بے مثل شناور تھے۔ وہ ایک بلند پایہ مصنف تھے اور افکار کی دنیا میں ہلچل پیدا کردینے اور اپنے عہد کے مشہور خطیب بھی تھے جنگ آزادی میں انہوں نے اپنے جسم وجان اور وقت ومال کی بے مثال قربانیاں دی ہیں وہ ایک صاحب عزیمت شخص تھے ان کی زندگی میں بے شمار مواقع ایسے آئے تھے جب وہ رخصت سے فائدہ اٹھا سکتے تھے لیکن ان کی عزیمت اور بلند ہمتی سے رخصت کی پناہ گاہوں کی پستیوں اور ذلتوں کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ عزائم وقت میں ان کے ذوق فکر وعمل کا پایہ ہمیشہ بلند رہا۔ ذوق میزبانی سے انہیں حصہ وافر ملا تھا وہ اپنے دور کے علماء وامراء اور صوفیہ ومشائخ میں سب سے بڑے مہمان نواز تھے۔ عرب کے حسن طبیعت اور عجم کے سوز دروں سے ان کی طبیعت کا خمیر اٹھا تھا۔

حضرت شیخ الاسلام کے یہ تمام وہ کمالات ہیں جو حضرت کی صحبت وقربت رکھنے والا ہر شخص محسوس ومعلوم کرلیتا تھا۔ اور آج بھی حضرت کی زندگی کے مطالعے سے بہ آسانی ان خصائص وکمالات کا اندازہ کرلیا جاتا ہے لیکن میں حضرت کے

بعض ان کمالات کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں گا جن کے وزن وقدر کے اندازے کے لیےعلم وسائنس کی اس ترقی یافتہ دنیامیں ابھی تک کوئی میزان اور پیمانہ ایجاد نہیں ہوا ہے۔

اخلاص:

حضرت شیخ الاسلام کے ان کمالات میں سے جو دیکھے اور دکھائے نہیں جاسکتے۔البتہ کوئی شخص بے میل ذوق،متوازن ذہن اور قلب سلیم کی نعمتوں سے نوازا گیا ہوتو وہ حضرت کے ان خصائص وکمالات کو محسوس کرسکتا ہے۔

حضرت کی سیرت کا پہلا عنصر،حسن اخلاص ہے لیکن اخلاص کیا ہے اخلاص ایک جوہر سیرت ہے اس کا بیج قلب کی سرزمین میں پھوٹتا ہے برگ وبار پیدا کرتا ہے اوراس کی سرمدی مہک سے مشام روح معطر ہوجاتا ہے۔ اس جوہر سیرت کو ہم اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے لیکن ذوق بے میل اور قلب سلیم ہوتو اسے خوشبو کی طرح محسوس ضرور کرلیا جاسکتا ہے۔ جوہر اخلاص داد وتحسین سے بے نیاز اور ستائش کی تمنا سے بے پروا ہوتا ہے۔اخلاص چاہتا ہے کہ صلہ وثواب کی آرزو سے قلب کو پاک کرلیا جائے۔حسن اخلاص عشق کے مدعی سے مطالبہ کرتا ہے کہ میری محبت کا دم بھرتے ہو اور میرے قرب وصال کے طالب ہو تو پہلے اپنی ذات کے تمام اغراض سے دست بردار ہوجاؤ اور دنیاوی عیش وراحت کی ہرخواہش کو اپنے دل سے نکال پھینکو۔غیرت اخلاص انسانی سیرت کی کسی کوتاہی کو برداشت نہیں کرسکتی۔اخلاص اور لوث وغرض کبھی ایک قلب میں جمع نہیں ہوسکتے۔ صاحب غرض کبھی صاحب اخلاص نہیں ہوسکتا، جو بے غرض ہوتا ہے وہی صاحب اخلاص ہوتا ہے اور جو بے غرض ہوتا ہے وہ بے پناہ ہوتا ہے اوراسے بہ قول ایک عارف کے تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی۔

حضرت شیخ الاسلام بے غرض تھے۔قوم وملت کی خدمت کو شعار بنایا اور تحریک آزادی کی راہ میں قدم رکھا تو پہلے اپنے قلب کو غرض سے پاک کرلیا تاکہ کوئی تلوار انہیں کاٹ نہ سکے۔حیدرآباد (دکن) کے وظیفے کی رشوت ہو یا کسی سرکاری مدرسے (مثل مدرسۂ عالیہ کلکتہ) کی پرنسپل شپ کی پیشکش ہو یا جامعہ ازہر (مصر) کے منصب بلند کا لالچ ہو۔حالات کی سنگینی کا خوف ہو یا خاندان کے مستقبل کا اندیشہ،انہوں نے ہر خوف وحزن سے اپنے قلب کو پاک کرلیا تھا۔اگر انہوں نے دارالعلوم میں کوئی مقام حاصل کیا تھا یا جمعیۃ علمائے ہند کی صدارت کو قبول کرلیا تھا تو صرف کسی کو آگے بڑھتے اور ذمہ داری کا بوجھ اٹھاتے نہ دیکھ کر،اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا میدان خالی پاکر اور غلام ملک میں استعمار واستبداد کے عذاب سے سسکتی انسانیت کو نجات دلانے کے لئے صرف اپنے اسلامی اور انسانی فرض کی ادائیگی کے لیے قدم آگے بڑھایا تھا۔اگر چہ حضرت کا اخلاص تیس سال سے زیادہ عرصے تک آزمائش کی کسوٹی پر بار بار پرکھا جاتا رہا تھا اور آپ کے اخلاص کا سونا ہر دفعہ زرخالص ثابت ہوچکا تھا،لیکن ابھی آزمائش کا ایک مرحلہ باقی تھا یہ مرحلہ ملک کی آزادی کے بعد اس وقت پیش آیا جب حضرت کی خدمت میں ملک کا سب سے بڑا سول اعزاز پدم بھوشن پیش کیا گیا اگر ہندوستان میں چند حضرات اس کے مستحق تھے تو حضرت اس اعزاز کا سب سے زیادہ استحقاق رکھتے تھے یہ حضرت کی عظیم الشان قومی خدمات کا صلہ نہیں،اعتراف تھا یہ اعزاز حکومت یا انتظامیہ کی طرف سے نہیں تھا بلکہ قوم کی جانب سے ملک کو آزادی اور قوم کو غلامی واستبداد کے عذاب سے نجات دلانے میں ان کی خدمات کے لئے اظہار تشکر تھا اس کو قبول کرلینے کے جواز میں،ایک سوایک دلیلیں پیش کی جاسکتی تھیں اور آج بھی کہ ملک کی آزادی کو نصف صدی پوری ہونے والی ہے اور ایک قرن آپ کی وفات حسرت آیات پر بھی گزر چکا ہے،اس اعزاز کے لیے آپ کے استحقاق اور جواز کے بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں آپ کو معلوم ہے کہ حضرت شیخ الاسلام نے قوم کی اس پیش کش اور اعزاز کا کیا جواب دیا تھا؟ کیا یہی جواب نہ تھا کہ میں نے جو کچھ کیا وہ اسلام کے ایک شرعی حکم اور ملکی فرض کی ادائیگی کے لیے تھا صلہ وستائش کی آرزو،اعتراف خدمت کے جذبے اور کسی اعزاز ومنزلت کے لیے نہ تھا۔

استقامت:

حضرت شیخ الاسلام کی سیرت کی ایک خوبی وہ ہے جسے ہم استقامت سے موسوم کرتے ہیں۔آپ جانتے ہیں کہ ایک شخص اپنے معتقدات وافکار میں نہایت مخلص ہوسکتا ہے لیکن اخلاص کے لیے یہ لازم نہیں ہوتا کہ اس میں استقامت بھی ہو، یہ بات بالکل اسی طرح ہوتی ہے کہ جس طرح ایک صاحب استقامت کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ وہ راہ حق وصواب پر بھی ہو۔بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے فکر میں مخلص ہوتا ہے لیکن وہ راہ حق وحریت کے شدائد ومصائب کو برداشت نہیں کرسکتا۔اگر آپ چاہیں تو رہروان جادۂ حق وحریت کو ان کے ذوق فکر وعمل کے لحاظ سے اس طرح تقسیم کرسکتے ہیں۔

۱۔ وہ حضرات جو فکر صحیح رکھتے ہیں یعنی حق پسند ہوتے ہیں لیکن راہ عمل وسعی کے شدائد اور اعلان حق کے نتائج سے اس درجہ خوف زدہ ہوتے ہیں کہ لسان حق کا اعتراف واعلان نہیں کرسکتے۔

۲۔ وہ حضرات جو فکر صحیح بھی رکھتے ہیں اور لساناً حق کا اعتراف واعلان بھی کردیتے ہیں لیکن آزمائش کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے اور

۳۔ وہ حضرات جو حق شناس بھی ہوتے ہیں،اعلان واظہار حق سے بھی ان کی زبانیں بند نہیں رہتیں اور جب اس راہ کی مشکلات پیش آتی ہیں انہیں خوف زدہ کرنے کے لیے پھانسی کے تختے لگا دیئے جاتے ہیں، آزمائش کی صلیبیں کھڑی کردی جاتی ہیں اور تعذیر وتعذیب کے لیے زندانوں اور کال کوٹھریوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔پھر انہیں متاثر کرنے کیلئے ان کے سامنے سے انعام یافتہ انسان نما حیوانوں کی قطاریں گزاری جاتی ہیں۔پھر ان سے دریافت کیا جاتا ہے کہ بتاؤ حالات ووقت میں سچائی کا راستہ کون سا ہے؟ لیکن وہ نہ تو کسی چیز سے متاثر ہوتے ہیں،نہ کسی بات سے خوفزدہ ہوتے ہیں اور نہ کسی عمل سحر سے دھوکہ کھاتے ہیں۔ان کا جواب ایک ہی ہوتا ہے کہ تو اپنی طاقت وقوت سے دھوکا نہ کھا۔اقتدار کا گھمنڈ نہ کر،انسانوں پر ظلم سے باز اور باطل اور غلامی کے مقابلے میں حق وآزادی کے انتخاب کا حق ان سے نہ چھین۔

حضرت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ رہروان جادۂ حق وحریت کی اس آخری جماعت کے رہنما تھے۔آپ جانتے ہیں کہ کسی طاقت کی طرف سے کسی عہدہ ومنصب کی پیشکش سیدھی انگلی سے گھی نکالنے کی کوشش کا نام ہے اقتدار کے راستے سے کسی کو ہٹانے کی کوشش کا یہ پہلا مرحلہ ہوتا ہے پس ضروری ہے کہ اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو انہیں ٹیڑھا کرلیا جائے اور اگر پہلے مرحلے میں کامیابی نہ ہو تو قید وبند اور تعزیر وتعذیب کے دوسرے مرحلے کا آغاز کردیا جائے حضرت شیخ الاسلام کی پوری زندگی تاریخ کی روشنی میں دنیا کے سامنے ہے جسے دیکھنے کے لیے کسی باطنی بصیرت کی ضرورت نہیں،ظاہری آنکھوں سے دیکھا اور پڑھا جاسکتا ہے کہ قید وبند اور تعزیر وتعذیب کے ہر مرحلے میں آپ کی استقامت غیر متزلزل رہی۔جس طرح حکومت کی کوئی پرفریب پیش کش آپ کے اخلاص کو متزلزل نہ کرسکی تھی۔اسی طرح تعذیر وتعذیب کا خوف آپ کے پائے ثبات کو اس کی جگہ سے نہ ہلا سکا۔

آپ میں سے بعض حضرات شاید اس بات میں شک کریں کہ ایک دور میں ایک جماعت کی طرف سے حضرت کے خلاف جو ہنگامہ برپا کیا گیا تھا اسے ملک کے خان بہادروں،نوابوں، جاگیرداروں کی سرپرستی اور حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی لیکن اس بات کو تو بہر حال آپ تسلیم فرمائیں گے کہ کسی صاحب اخلاص ودیانت کا دنیا بھر کو راضی رکھنا اور خوش کرنا ممکن نہیں۔ممکن ہے ایک بڑی جماعت کو وہ اپنے اخلاص ودیانت کا گرویدہ بنالے لیکن افراد کی ایک چھوٹی سی چھوٹی جماعت اس کی مخالف ضرور رہ جائے گی۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ افراد کی اس چھوٹی سی جمعیۃ کا تعلق اس خاص جماعت کے نظام فکر سے نہ تھا جس کے وہ واقعی رکن یا کارکن تھے لیکن سوال یہ ہے کہ اختلاف وناراضگی کی صورت میں ان کا رویہ کیا ہونا چاہئے تھا؟ آپ اس سوال کا جواب دینے کی زحمت نہ اٹھایئے۔لیکن یہ ضرور سوچئے کہ مخالفت اور توہین وتضحیک کے اس طوفان بے تمیزی میں حضرت شیخ الاسلام کی استقامت کا کیا عالم رہا؟

خواہ آپ زبان سے اس کا اقرار نہ کریں لیکن آپ کا دل گواہ دے گا کہ آزمائش کے اس مرحلے میں بھی جو حکومت کی طرف سے قید وبند اور تعزیر وتعذیب کی صورت میں پیش آیا ہو،خواہ کسی جماعت کے کارکنوں کی طرف سے غیر شریفانہ مخالفت اور تضحیک وتوہین کی صورت میں نمایاں ہوا ہو،حضرت شیخ الاسلام کا اخلاص بے عیب اور استقامت بے داغ ثابت ہوتی ہے۔

جامع مذہب وسیاست:

حضرت شیخ الاسلام کی ایک خوبی علم وعمل، دین وسیاست، تصور وحقیقت، روز وشب کے معمولات اور ملی قومی تقاضوں، واجبات دنیا وفکر آخرت کا حسن امتزاج وتوازن اور کمال جامعیت ہے۔

ہماری تاریخ بڑے بڑے اصحاب علم سے، عظیم مدبروں اور مفکروں سے، نہایت ذہین افراد سے ملک وقوم کے بڑے بڑے خدمت گزاروں، نہایت دین داروں، شریف دنیا پرستوں سے، عدیم المثال شاعروں سے، سراپا عمل مجاہدوں سے، شب زندہ دار زاہدوں اور عابدوں سے اور اپنے علم وعمل سے یا اپنے ذہن کی فکر پیمائیوں اور تخیل آفرینیوں سے ایک دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے والوں سے کبھی خالی نہیں رہی لیکن حضرت شیخ الاسلام کے توازن وجامعیت کی شخصیت کی دید کے لیے چشم نرگس کو صدیوں تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام علم وعمل کی جامعیت کی مثال تھے۔ وہ عالم تھے مگر فکر وفلسفہ کی گھتیاں ہی نہ سلجھاتے رہے، عملی زندگی کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا۔ زندگی کے میدان میں ان کی شخصیت سراپا عمل نظر آتی ہے لیکن علم وفکر کی دنیا سے ان کا رشتہ اس وقت بھی قائم ہوتا تھا دین کے واجبات اور سیاست کے فرائض میں ایک ایسا حسین توازن پیدا کیا تھا کہ خالص سیاسی ہنگاموں اور ہجوم افکار واعمال میں بھی فرائض وسنن تو کیا مستحبات بھی نہ چھوٹتے تھے آپ کی ذات گرامی تصور وحقیقت کا مجمع البحرین تھی روز وشب کے معمولات میں فی اللیل رہبان وفی النھار فرسان کی مثال تھے۔ حضرت دین وسیاست کی تفریق کے قائل نہ تھے لیکن آپ کے موازن فکر اور جامع سیرت کا کمال یہ تھا کہ قوم اور ملت کا ہر تقاضا اور ہر کام اپنے وقت پر اور اپنے دائرے میں صحیح طور پر انجام پاتا رہا۔

وہ انسان جو اپنا جی جان اور خاندان کنبہ رکھتا ہے ان کے واجبات اور ذمہ داریوں سے کیوں کر چھٹکارا پا سکتا ہے، بچوں کی پرورش ان کی تعلیم وتربیت اور ان کی زندگی کی ضروریات واحتیاجات بعض اوقات انسان کو فکر آخرت سے غافل بھی کر دیتی ہیں لیکن ٹھیک اسی طرح آخرت کی فکر اور عبادت وریاضت کا ذوق وانہماک بھی دنیاوی واجبات وفرائض میں غفلت اور کوتاہی کا موجب ہوتا ہے جام شریعت اور سندان عشق سے کھیلان اور دونوں کے حدود برقرار رکھنا، ہر مدعی اتباع شریعت اور حقوق عباد ودنیا کے فہم ادراک کا ذوق رکھنے والے کے لیے ممکن نہیں رہتا لیکن حضرت شیخ الاسلام کے لیے جام وسندان کا یہ ملاپ محض ایک کھیل تھا۔ حضرت کا کمال یہ تھا کہ وہ ایک کامل درجے کی دینی واسلامی زندگی اور اس کے تمام ظاہری وباطنی لوازم کے ساتھ سیاست کے بحر مواج میں تختہ بندی کا عزم لے کر اترے تھے اور اس کے پانی کی ایک چھینٹ سے اسلامی شرعی زندگی کو آلودہ اور دامن تر کیے بغیر وہ زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہوگئے۔

فیضان سیرت کا ایک خاص پہلو:

اب میں حضرت شیخ الاسلام کے فیضان سیرت کے ایک خاص پہلو کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ کسی خاص کمیونٹی کے مفادات کی بات کرنا، اس میں مذہبی عصبیت پیدا کرنا، اس کے افراد کو منظم کرنا، انہیں خاص انداز سے تعلیم دینا، ان کی تربیت کرنا اور اس کمیونٹی کے سامنے ایک نصب العین رکھنا اور اگر پہلے سے کوئی نصب العین ہو جو فراموش کر دیا گیا ہو تو اسے یاد دلانا اور اس کے لیے جان ومال کی قربانی اور وقت کے ایثار کی دعوت دینا اور اسی ذریعے کو اس کی ہر طرح کی کامیابی کا ضامن قرار دینا عام طور پر فرقہ واریت کہلاتا ہے اور کسی سوسائٹی میں فرقہ واریت کی زہرناکی اور سمیت اس کی زندگی اس کی جمعیۃ اور امن وسکون کے لیے تباہی اور ہلاکت کا جو سروسامان اپنے اندر رکھتی ہے اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ حضرت شیخ الاسلام کی زندگی آپ کے سامنے ہے اس کا یہ پہلو چھپا ہوا نہیں کہ حضرت نے مسلمانوں کے ملی اور فرقہ وارانہ مفاد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ مسلمانوں میں مذہبی عصبیت پیدا کی۔ ان میں اسلامی زندگی پیدا کرنے کی تلقین کی۔ رضائے الٰہی اور اتباع سنت کو زندگی کا نصب العین بنانے اور اسلامی فکر وسیرت کو اپنانے کی دعوت دی اور اسلام اور صرف اسلام کے لیے جان ومال اور وقت کے ایثار وقربانی کا جذبہ پیدا کرنے کے زندگی بھر داعی رہے جمعیۃ کے نظام کو مستحکم کرنے یعنی مسلمانوں کی بہترین خدمات انجام دینے کے لیے رضا کاروں کے ایک مستحکم نظام کی ضرورت کو محسوس کیا اور ملت کے جاں نثاروں کا ایک نظم قائم بھی کر دیا اور جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت خود بھی ایک کامل درجے کی دینی اور شرعی زندگی رکھتے تھے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے ذبیحۂ گاؤ کے لئے ہمیشہ اصرار کیا نہرو رپورٹ کی مخالفت کی، بندے ماترم کے خلاف احتجاج کیا واردھا تعلیمی اسکیم کو رد کرتے ہوئے ایک متبادل تعلیمی اسکیم پیش کی۔ سی پی گورنمنٹ کی وویا مندر اسکیم کو جوں کا توں قبول کرنے سے صاف انکار کیا۔ کشمیر اور دوسری ریاستوں میں مسلم حقوق کی پامالی کے خلاف نہ صرف جمعیۃ کے پلیٹ فارم سے احتجاج کیا، اخبارات میں مضامین لکھوائے اور عملی میدان میں حصہ لیا، گاندھی جی کے پرارتھنا کے گیت کو مسلمانوں کے عقیدے کے بالکل خلاف، مسلمانوں کے لیے قطعاً ناقابل قبول بتایا اور اسے صرف گاندھی جی کا فعل قرار دیا۔ ۱۹۳۷ اور ۱۹۳۸ء کے دوران میں کانگریسی حکومتوں کے کردار اور فیصلوں کے خلاف سب سے زیادہ لیکن سنجیدہ، مدلل اور مثبت تنقید کے محاذ کے رہنما حضرت شیخ الاسلام تھے۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ حقیقت اور حضرت کی سیرت کا یہ فیضان بھی ملک کے سامنے ہے کہ اس سے فرقہ واریت پیدا نہیں ہوئی جو انسانی سوسائٹی کے لیے تباہی اور ہلاکت کا موجب ہوتی ہے حضرت شیخ الاسلام ایک مذہبی شخصیت ہونے کے باوجود ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح کے قومی رہنما تھے حالانکہ تاریخ میں ایسے قومی رہنماؤں اور سیرتوں کی مثالیں بھی موجود ہیں جو اگرچہ قطعاً مذہبی نہ تھیں اور بقول مولانا غلام رسول مہرؔ مسلمان تھے لیکن سورۂ اخلاص بھی نہ پڑھ سکتے تھے لیکن ان کے ایک ایک قول اور ایک ایک عمل نے انسانی سوسائٹی اور ملک کی معاشرتی زندگی میں مذہبی تعصب اور منافرت کا جو زہر گھولا تھا، وہ چالیس سال سے زیادہ عرصے میں بھی دور نہ ہو سکا۔ اور فرقہ واریت کا جو سبق ایک خاص قومی سطح پر حالات سے نمٹنے کے لیے پڑھایا گیا تھا، اس کے اثرات نے معاشرتی زندگی کو تہ وبالا اور باہمی اعتماد ومحبت کی فضا کو مسموم کر دیا ہے۔

جو بات کہنا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ ایک شخص نے پڑوسی کو ڈرانے کے لیے (تعصب کا) ایک کتا پالا تھا بھونکنا اور کاٹنا کتے کی فطرت میں شامل ہوتا ہے ایک مدت کے بعد مالک نے ضرورت نہ سمجھتے ہوئے کتے کو آزاد کر دیا اب وہ کتا دوسروں ہی کو نہیں اپنے سابق مالک کے خاندان کو بھی بھنجھوڑ رہا ہے۔ پورا خاندان خوف زدہ ہے۔ خاندان کا اطمینان وسکون تباہ ہو گیا ہے اب مالک دوبارہ اس کے گلے میں پٹا ڈالنا اور اسے قابو میں کرنا چاہتا ہے لیکن اب یہ اس کے بس کی بات نہیں رہی یہ ایک عذاب الٰہی ہے اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس کی بداعمالیوں اور ظلموں سے باز آجانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مہلت دیتا ہے اور رحمت الٰہی انتظار کرتی ہے کہ نزول عذاب سے پہلے وہ قوم اپنی بداعمالیوں سے باز آجائے، لیکن جب اس کی مہلت ختم ہو جاتی ہے اور عذاب کا نزول شروع ہو جاتا ہے تو پھر سنت الٰہی پوری ہو کر رہتی ہے اور قوم کو اس کی بداعمالیوں کی پوری پوری سزا ملتی ہے۔

اور یہ حضرت شیخ الاسلام کی سیرت ہی کا فیضان ہے کہ حضرت کے وابستگان دامن، وہ ہندوستان میں ہوں، خواہ پاکستان میں یا دنیا کے کسی اور ملک میں ہوں، فرقہ واریت کے جذبات سے پاک، تعصب ومنافرت سے دور ونفور، خدا کی مخلوق سے سب سے بڑھ کر محبت کرنے والے اور دنیا کے سب سے زیادہ فراخ قلب انسان ہیں، صاحب عزم وہمت ہیں، اپنے مذہب پر مستقیم، اپنے اعتقاد میں راسخ اور اپنے دلوں میں سارے جہاں کا درد اور احترام آدمیت لیے ہوئے بلاتفریق مذہب وملت دنیا کے تمام انسانوں کی خدمت کے لیے ہمہ وقت آمادہ ومستعد نظر آتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام کی سیرت کے اس پہلو کے مطالعے اس کے فیضان کے مشاہدے اور حالات کے تجزیئے سے ہم یہ نتیجہ بھی نکالتے ہیں کہ یہ خیال ہرگز درست نہیں کہ فرقہ واریت یا تعصب کا تعلق مذہبی خیالات وافکار یا تعلیمات سے ہے۔

سیاسی رہنمائی:

حضرت شیخ الاسلام جنگ آزادی میں صف اول کے رہنما تھے۔ ریشمی رومال تحریک کی وہ اہم شخصیت تھے (۱۹۱۷ء) قید مالٹا سے رہائی اور ہندوستان واپسی (۱۹۲۰ء) کے بعد حضرت نے ایک بھرپور سیاسی زندگی گزاری۔ اس دوران میں سب سے پہلی تحریک خلافت کی تھی اس کے لئے ترک موالات کا جو پروگرام وضع کیا

گیا تھا اسے کامیاب بنانے اور تحریک خلافت کے مقاصد کے حصول کے لیے آپ نے سرگرم حصہ لیا۔(۲۱۔۱۹۲۰ء) سائمن کمیشن کو بے ضرورت سمجھا اور اس کی مخالفت کی (۱۹۲۷ء) کمیونل ایوارڈ کو قومی مقاصد کے لیے نہ صرف ناکافی سمجھا بلکہ نقصان دہ تصور کیا اور اس کی مخالفت کی (۱۹۳۲ء) واردھا تعلیمی اسکیم پر تنقید کی اور اسے قابل قبول بنانے کیلئے مناسب ومثبت تجاویز پیش کیں (۱۹۲۸ء) شاردا ایکٹ کے خلاف تحریک کے رہنماؤں میں آپ ایک بلند قامت شخصیت تھے (۱۹۲۹ء) سول میرج کے قانون کے خلاف تحریک پیدا کی (۱۹۳۲ء) اسلامی اوقاف کی حفاظت اور انہیں ان کے متعین مصارف میں خرچ کرنے اور حکومت کے دست تصرف سے انہیں بچانے کی کوششوں کی رہنمائی کا شرف جمعیۃ علمائے ہند اور اس کے صدر نشین حضرت شیخ الاسلام کو حاصل تھا (۱۹۳۷ء) ودیا مندر اسکیم کو اس کی طے شدہ صورت میں قبول کرنے سے انکار کیا ۱۹۳۸ء) اردو کے بارے میں یوپی کانگریس کمیٹی اور کانگریس حکومت کے رویے کو انصاف اور کانگریس کی متفقہ پالیسی کے خلاف پایا تو انہیں فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے باز رکھنے کی کوشش کی (۱۹۳۸ء) شریعت بل کے نفاذ کی کوششوں میں سب سے زیادہ منظم حصہ حضرت کی جماعت نے لیا تھا (۱۹۳۷ء) نظم جماعت کی تحریک کی رہنمائی (۱۹۲۰ء) سے اور امارت شرعیہ کے قیام کی تحریک کا سہرا جمعیۃ علمائے ہند اور اس کے زعما کے سر ہے۔اس کی تاریخ ۱۹۴۷ء سے تقریباً ۲۵ سال پہلے شروع ہوتی ہے انفساخ نکاح کے قانون، خلع بل، قاضی بل، طلاق کا ترمیمی بل وغیرہ کے لیے کوششیں (۴۱۔۱۹۳۹ء) حضرت شیخ الاسلام اور جمعیۃ علمائے ہند جس کے آپ صدر تھے، کی ملی خدمات میں سنہری حرفوں سے لکھی جائیں گی۔

حضرت شیخ الاسلام کے یہ تمام کارنامے ملی مفاد اور اسلامی شرعی زندگی کے لیے قیام وتحفظ کے نقطہ نظر سے تھے آپ نے ان تمام تحریکوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جن کا فائدہ کسی ایک قوم یا ملت کے لیے مخصوص نہ تھا بلکہ ان کے فوائد نہ صرف پورے ملک کے لیے عام تھے۔ بیرون ملک کے مسلمان ممالک اور تمام برطانوی مقبوضات اور دنیا کی تمام محکوم اور غلام قوموں کو پہنچنے والے تھے۔ان تحریکوں میں سب سے بڑی تحریک ملک کی آزادی اور استقلال قومی کی تحریک تھی ،اس کے بعد ریشمی رومال اور خلافت کی تحریکات اور ترک موالات کا پروگرام تھا، پھر سول نافرمانی کی تحریک (۱۹۳۰ء و۱۹۴۰ء) نمک ستیہ گرہ، کھدر کے استعمال اور سودیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریکات پیدا ہوئی اور آخری اہم تحریک ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک (۱۹۴۲ء) تھی۔حضرت شیخ الاسلام نے ان تمام تحریکوں میں حصہ لیا اور اس سلسلے میں آپ کو قید و بند کی صعوبتوں اور ایثار وقت ومال کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔

۱۹۴۰ء کے بعد آپ کو سخت آزمائشوں اور بڑی کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا۔خاص طور پر ملک کی آزادی سے قبل کے ڈھائی تین برس آپ کے لیے سخت مشکلات کے تھے۔اس دوران لوگ آپ کی جان کے لاگو اور عزت کے دشمن ہو گئے تھے۔آپ کو نہ صرف تحریک پاکستان کا مخالف بلکہ مسلمانوں کا دشمن کہا گیا۔حالانکہ ہندوستان کے سیاسی مسئلے میں آپ اپنا ایک نظریہ اور مسئلے کے حل کے لیے ایک فارمولا رکھتے تھے اگر کوئی دوسرا نظریہ رکھنے والا جمعیۃ علماء کے زعما سے یہ توقع رکھتا کہ وہ اس کے حق میں اپنے نظریئے اور اس کے لیے اپنے بہترین دلائل سے دست بردار ہو جائیں و یہ حق حضرت شیخ الاسلام جمعیۃ علمائے ہند اور دوسری قوم پرور مسلمان جماعتوں اور ان کے زعما کو بھی حاصل ہونا چاہئے تھا کہ وہ ان کے حق میں اپنے نظریئے اور اپنے دلائل سے دستبردار ہو جائیں۔جمعیۃ علمائے نے جو فارمولا وزارتی مشن کے سامنے پیش کیا تھا اور جسے مدنی فارمولا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اسے مجلس احرار اسلام، مومن کانفرنس، جمعیۃ القریش، شیعہ پولیٹیکل کانفرنس، مسلم مجلس کے علاوہ سندھ، بلوچستان، سرحد، بنگال وغیرہ کی متعدد جماعتوں کی بھی حمایت حاصل تھی۔لیکن کسی جماعت نے دوسری جماعت سے بے سوچے سمجھے اس منصوبے کو مان لینے کی توقع کے بجائے اصل مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ اور ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور متفقہ طور پر کسی ایک نتیجے پر پہنچنے کی آرزو کی تھی۔

مدنی فارمولا:

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ملک کی سیاسی اور فرقہ وارانہ مسئلے میں اپنی ایک مستقل رائے رکھتے تھے۔حضرت کے نزدیک اس مسئلے کا صحیح ترین حل وہ فارمولا تھا جسے جمعیۃ علمائے ہند نے اپنے پلیٹ فارم سے ۱۹۳۱ء میں پیش کیا تھا اور بعد میں بعض وضاحتوں اور تشریح کے ساتھ ۱۹۴۵ء میں قوم کے سامنے رکھا تھا اور یہی فارمولا ملک کی قوم پرور جماعتوں کی تائید کے ساتھ کیبنٹ مشن کے سامنے پیش کیا تھا جس کے بارے میں مشن کی رائے تھی کہ یہ ایک سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، اس کے پیچھے سیاسی بصیرت کارفرما ہے اور قابل عمل اس فارمولے میں برصغیر ہندوسان کے ہر صوبے کو مستقل اکائی کی حیثیت حاصل تھی، چند مفوضہ امور کے علاوہ تمام معاملات میں صوبے آزاد و خود مختار تھے۔مفوضہ امور کی ذمے داری مرکز کی تھی مرکز کی ہیئت ترکیبی میں ۲۵ ہندوؤں کے بالمقابل ۴۵ سیٹیں مسلمانوں کی تھیں جب کہ ۱۰ اسیٹیں اقلیتوں کے لیے مخصوص تھیں کوئی ایسا سیاسی، اجتماعی، تہذیبی معاشرتی مسئلہ جس کا تعلق مسلمانوں سے ہو، ان کی دو تہائی اکثریت کے اتفاق رائے کے بغیر طے نہیں کیا جاسکتا تھا۔

یہ وہی منصوبہ تھا جس کے صوبوں کو مختلف گروپوں کی شکل میں مرکز کی اسی ہیئت ترکیبی کے ساتھ وہی حقوق واختیارات تفویض کئے گئے تھے اور کانگریس کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد نے پیش کیا تھا اور کیبنٹ مشن نے بعض جزوی ترامیم کے بعد اپنا لیا تھا اور ملک کی دیگر جماعتوں کے بہ شمول مسلم لیگ کے زعما کی اس یقین دہانی پر کہ اس کے ذریعے پاکستان کی بنیاد فراہم کردی گئی ہے، مسلم لیگ کونسل نے بھی اسے منظور کرلیا تھا، لیکن کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کی جانب سے اس منصوبے کی ایک شق کی غلط تشریح سے فائدہ اٹھا کر مسلم لیگ اس منصوبے کے بارے میں اپنی منظوری سے دستبردار ہوگئی اور اپنے سابق موقف پر لوٹ گئی۔جس پر اس کے ثبات نے تقسیم ملک کے نتیجے اور قیام پاکستان کے انجام پر پہنچادیا۔

اب جس طرح اس عہد کی خوبیاں بانیان پاکستان کے نصیب کی تاریخ ہیں، اسی طرح اگر اس دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کے مسئلے میں پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں یا پاکستان میں مختلف قومیتوں اور مقامی اور غیر مقامی کے مسئلے نے سر اٹھایا ہے، اسلامی نظام کے نفاذ کی منزل تقریباً نصف صدی کی مسافت طے کرنے کے بعد بھی قریب نظر نہیں آتی، اسلام کے نظام سیاسی یا طرز حکمرانی کا مسئلہ ہنوز تصفیہ طلب ہے اسلامی تہذیب کی تعریف پر بھی اگر اتفاق نہیں ہوسکا، اردو ہندی مسئلے کے بجائے اردو بنگالی مسئلہ پیدا ہو کر ملک دولخت ہو چکا ہے ،اردو اور مقامی زبانوں کا مسئلہ موجود ہے اور اردو کے نفاذ کی راہ بھی ہموار نہیں اور سب سے بڑھ کر شریعت کا مسئلہ ہی مابہ النزاع ہے تو اس کے لیے اسی تحریک کے رہنماؤں کی بدنیتی اور بے دینی کو ذمے دار قرار دینا چاہئے اور یہ حقیقت تسلیم کی جانی چاہئے کہ زندگی کے واقعی مسائل کے تصفیے کے لیے حقیقی بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے زندگی کے مسائل خوبصورت نعروں اور گلے کی قوت سے طے نہیں کیے جاسکتے اور نہ مفروضوں پر ان کے تصفیے کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔

ماخوذ از: شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، ایک سیاسی مطالعہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری، مکتبہ رشیدیہ اردو بازار، کراچی، 021-32767232

دینی مدارس اسلامی تہذیب کے پشتی بان ہیں

قائد جمعیۃ دامت برکاتھم کا وفاق المدارس کے زیر اہتمام کانفرنس سے خطاب

خطبہ مسنونہ کے بعد قائد محترم نے فرمایا:

''جناب صدر محترم، اکابر امت، بزرگان ملت، حضرات علمائے کرام، میرے دوستو، بھائیو اور دارالعلوم دیوبند کے بیٹو!

سب سے پہلے تو میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے بروقت دینی مدارس کے تحفظ اور اس پلیٹ فارم سے دنیا کو امن کا پیغام دینے کا اہتمام کیا۔ میں اس کامیاب اجتماع پر وفاق المدارس العربیہ پاکستان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی وفاق المدارس کے وہ فضلاء جنہوں نے امتیازی درجات میں کامیابی حاصل کی اور وہ ممتاز شخصیات جن کو اس سٹیج پر اعزازات سے نوازا گیا انہیں بھی دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہو۔

میرے محترم دوستو! آج جس کاروان کا یہاں آپ پڑاؤ دیکھ رہے ہیں، یہ 20 مارچ کو ملتان کے اسٹیڈیم سے شروع ہوا کراچی اور کوئٹہ کا سفر کرتے ہوئے پشاور پہنچا اور ان شاء اللہ العزیز یہ کاروان آگے بڑھتا جائے گا۔ اللہ تعالی ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم تادم مرگ اس کاروان کا حصہ رہیں۔

میرے محترم دوستو! ہماری جو نسبت ہے وہ نسبت بڑی عظیم ہے۔ برصغیر کی تاریخ ہمارے اسلاف و اکابر کی جدوجہد اور قربانیوں سے بھری پڑی ہے۔ کبھی تو برصغیر کے مرکز دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کا خانوادہ اس برصغیر میں اسلام کے مستقبل کا محافظ رہا ہے، پھر یہی قافلہ کبھی ہمیں بالاکوٹ میں قربانی دیتا ہوا نظر آتا ہے اور کبھی شاملی کے میدان میں جان کے نذرانے دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ جدوجہد ہماری ذمہ داری ہے، کامیابی اور ناکامی یہ ہمارا مسئلہ نہیں، نتائج اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارا کام نتائج کے حصول کیلئے جدوجہد کرنا ہے، اس پر نتیجہ مرتب کرنا یا نہ کرنا یہ اللہ کی منشاء کے سپرد ہے۔ لیکن جب تمام راستے بند ہوگئے، تو یہ ہمت بھی میرے اکابر کو اللہ نے عطاء کی کہ دیوبند کے ایک مدرسے میں ایک طالب علم سے ایک نئی جدوجہد کا آغاز کیا، دیوبند مدرسے کا قیام ہوا اور بہت جلد برصغیر میں مدارس کا جال بچھا دیا گیا۔ اس مدرسے کا پہلا شاگرد محمود حسن ''شیخ الہند'' بن کر اسی مدرسے کے ایک فاضل کی حیثیت سے برصغیر کی سیاست کے افق پر چمکا اور یہی شیخ الہند تھا جس نے جمعیۃ علماء کی بنیاد رکھی، یہ جمعیۃ علماء جو دارالعلوم کی کوکھ سے جنم پائی، اس سے دارالعلوم کے قیام کا مقصد وجود وہ کوئی فرقہ تشکیل دینا نہیں تھا، کوئی ایک چھوٹا سا مکتب فکر دینا نہیں تھا بلکہ درحقیقت اس مدرسے نے ایک بار پھر پوری دنیا کو اسلام کا آفاقی نظام متعارف کرانا تھا، اسلام کی عالمگیریت دنیا کو متعارف کرانی تھی اور انسانیت کا وہ پہلا اور بنیادی پیدائشی حق، آزادی کا حق، اس کا درس انسانیت کو دینا تھا اور برصغیر کی آنے والی نسلوں کو دینا تھا۔ چنانچہ مدرسہ اور جمعیۃ علماء ایک دوسرے سے ایسے وابستہ ہیں کہ ایک کے وجود کے بغیر دوسرے کا وجود بے معنی ہو جاتا ہے۔

ہم نے پاکستان میں دیکھا، جمعیۃ علماء اسلام معرض وجود میں آئی، ہم تو چھوٹے تھے، میں نے جس گھر میں آنکھ کھولی، تو آپ جانتے ہیں کہ میں نے جمعیۃ علماء کے گھر میں آنکھ کھولی، میں نے جمعیۃ علماء کے فورم سے ابھرنے والی سیاست کے ماحول میں آنکھ کھولی ہے اور جب میں آنکھ کھول رہا تھا تو میں نے اپنی قبلہ گاہ حضرت مفتی صاحبؒ کو دیکھا کہ کبھی تو حضرت بنوریؒ ملتان تشریف لاتے، ہمارے گھر میں مہمان ہوتے، ہم چھوٹے انہی کے ماحول میں شرارتیں کرتے تھے اور وہ ہماری شرارتوں کو دیکھ کر مسکراتے تھے۔ اور کبھی میں اپنے قبلہ گاہ کو جامعہ خیر المدارس تشریف لے جاتے دیکھتا، حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ کیساتھ ملاقات کیلئے۔ پھر نتیجہ یہ نکلا کہ اس جامع مشاورت کے نتیجے میں وفاق المدارس معرض وجود میں آیا۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان، جمعیۃ علمائے اسلام، جمعیۃ علمائے ہند، دارالعلوم دیوبند یہ میرا سلسلہ نسب ہے اور اس سلسلہ نسب پر جان فدا ہونے کو جی چاہتا ہے۔

میرے محترم دوستو! بڑے ادوار گزرے ہیں، مشکلات کے ادوار گزرے ہیں۔ مشکل حالات سے دین اسلام کا یہ سفر آج ان حالات تک پہنچا ہے۔ 1500 سو سال کے بعد بھی آج اگر قرآن زندہ ہے، آج اگر جناب رسول اللہ ﷺ کی احادیث زندہ ہیں، فقہ کے علوم زندہ ہیں، آج اگر اسلام زندہ ہے تو یہ چودہ سو سال کی حق و باطل کی معرکہ آرائیوں اور اس کشمکش سے ہوتے ہوئے گزار ہے، اور آج بھی محفوظ ہے، اور یہ حفاظت 1500 سال کی اتنی شورشوں کے باوجود اللہ کے اس وعدے کا مصداق ہے کہ: یہ دین کو اتارا بھی میں نے ہے اور اس کی حفاظت بھی میں کروں گا۔'' یہ تو اللہ کی توفیق ہے کہ اس دین کی حفاظت کیلئے امت کے کون سے لوگ استعمال ہوتے ہیں۔ ہم اور آپ خوش قسمت ہیں کہ اللہ تعالی نے ہمیں اس زمرے میں پیدا کیا جو دین اسلام کی خدمت اور اس کی حفاظت کیلئے اپنے شب و روز صرف کر رہا ہے۔

میرے محترم دوستو! آج ایک بین الاقوامی ایجنڈا ہے، اور یہ بین الاقوامی ایجنڈا کثیر المقاصد ایجنڈا ہے۔ بنیادی چیز یہ ہے کہ عالمی قوتیں ایک بار پھر ہماری آزادی پہ جھپٹی ہیں اور پنجہ استعمار سے ایک بار پھر وہ ہماری آزادی کی قباء کو تار تار کرنا چاہتی ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ ہم نے اپنی آزادی کی حفاظت کرنی ہے، لیکن وہ جو ہم سے آزادی چھیننا چاہتے ہیں تو آزادی چھیننے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے وہ ہم سے ہمارا مذہب چھینیں اور پھر ہم سے ہماری تہذیب چھینیں، ہماری ماؤں اور بہنوں کے سروں سے حوا کی چادر نوچ لیں اور ہمارے جسم پر آراستہ ہمارے مذہب اور تہذیب کا لباس ہمارے جسم سے اتار دیں۔ جب مذہب نہیں رہتا، جب تہذیب نہیں رہتی، اس قوم کو غلام بنانا بڑا آسان ہو جاتا ہے۔ ہمیں اس حوالے سے سوچنا ہوگا۔ اگر انہوں نے آپ کے مذہب کو آپ کی تہذیب کو آپ سے چھیننا ہے تو یاد رکھئے کہ پھر مذہب کو فروغ دینے اور تہذیب کو تحفظ فراہم کرنے کا بنیادی فرض اور اس کی بنیادی ذمہ داری ہمارا مدرسہ پوری کر رہا ہے، یہ مدرسہ جہاں مذہب کا محافظ ہے وہاں یہ ہماری تہذیب کا بھی پشتی بان ہے، اسی لئے دباؤ مدرسے پر ہے کہ مدرسے کو کسی طرح مجرم ثابت کیا جائے، مدرسے کو کسی طرح دہشت گرد ثابت کر دیا جائے، مدرسے کو کسی طرح انتہا پسند اور شدت پسند ثابت کیا جائے۔

میرے محترم دوستو! میں دسمبر میں ہندوستان گیا تھا، دہلی کے رام لیلا میدان میں لاکھوں کے عظیم الشان اجتماع کو ابنائے دارالعلوم دیوبند نے امن کا پیغام دیا، پورے کرہ ارض کی انسانیت کو امن کا پیغام دیا۔ آج بھی یہ کانفرنس چاروں صوبوں میں دنیا کو امن کا پیغام دے رہی ہے۔ لیکن امن کی بات کرنے کا یہ معنی ہرگز نہیں ہے کہ ہم دفاعی پوزیشن پر ہیں۔ یہ مت سمجھا جائے دینی مدارس کے بارے میں۔ ہمیں معلوم ہے کہ تمہارا ایجنڈا کیا ہے، کیا سوچ رہے ہو۔ میرے مدرسے کے بارے میں تحفظات پیدا کرتے ہو، اس ذہنیت کیساتھ۔ افسوس مجھے یہ ہے کہ جہاں عالمی مغربی قوتیں دینی مدرسے کو منفی نگاہ سے دیکھ رہی ہیں، وہاں بدقسمتی سے میرے پاکستان کی کچھ قوتیں بھی مغربی آنکھوں سے میرے مدرسے کو دیکھ رہی ہیں۔ میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے کبھی سوچا ہے کہ تم کس کی صف میں جا کر کھڑے ہوگئے ہو، آج تمہاری شناخت کیا ہوگئی ہے۔ مدرسے کے بارے میں انگریز اور آج کے برطانیہ کی سوچ مختلف نہیں ہے۔ آج جو کشمکش ہے، اس حوالے سے ان کی بھی کچھ دلیل ہے، ہماری بھی کوئی دلیل ہے، ان کا بھی کچھ دعوی ہے ہمارا بھی کچھ دعوی ہے۔ ان کا دعوی یہ ہے کہ دنیا میں جو اتنا فساد ہے اس کا سبب مولوی ہے۔ اور ہمارا دعوی ہے کہ دنیا میں جو فساد ہے اس کا سبب تم ہو۔ میں اپنے دعوے پر شہادت پیش کرنا چاہتا ہوں۔

میرے علماء کرام! حوصلے بلند رکھو! احساس کمتری کا شکار مت ہوں، آپ نے ایک ہزار سال تک اس

برصغیر پر حکومت کی ہے۔اس پشاور کی شاہراہوں کا گرد آج بھی اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ ہندوستان کو فتح کرنے والے گھوڑوں کی ٹاپ یہاں سے گزری ہے ۔آپ بہت قابل فخر اور روشن تاریخ کے مالک ہیں اورانیسویں صدی میں اس برصغیر کی مسلمانوں کے قیادت علماء کے ہاتھ میں تھی پوری انیسویں صدی میں آپ فساد نہیں دیکھ رہے، نہ مسلم وغیر مسلم کے اندر خونریزی کا کوئی واقعہ اور نہ ہی مسلمانوں کے درمیان فرقہ پرستی کا کوئی واقعہ آپ کو انیسویں صدی میں نظر آتا ہے اسلئے کہ قیادت علماء کے ہاتھ میں تھی۔لیکن جب سے قیادت علماء کے ہاتھوں سے نکل کر آپ کے ہاتھ چڑھی ہے، آج اکیسویں صدی سے ہم گزر رہے ہیں، اکیسویں صدی فساد کی صدی ہے اس فساد کے ذمہ دار تم ہو ہم نہیں ہیں۔اور آج بھی پاکستان باوجود اسکے کہ مسلم قوم کے نام پر معرض وجود میں آیا آج یہاں ایک فرقہ دوسرے فرقہ کا خون بہار رہا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہئے، ماضی کی صدیاں کس کی گواہی دے رہی ہیں؟ جب قیادت ہمارے اکابر کے ہاتھ میں تھی تو امن تھا۔جب قیادت آپ کے ہاتھ میں آئی تو فساد آیا۔آج کے فساد کا تسلسل بھی آپ کے فساد کا تسلسل ہے اور امن کی جدوجہد آج بھی میرے اکابر کی جدوجہد کا تسلسل ہے۔

اور یاد رکھو! میں کئی فورمز پر یہ بات کہہ چکا ہوں اور آج بھی اس عظیم الشان فورم سے ایک بار پھر کہنا چاہتا ہوں، اپنی طرف سے نہیں۔اپنی جماعت کی طرف سے نہیں، اس مکتب فکر کی طرف سے نہیں، تمام مذہبی مکاتب فکر کی طرف سے اور پوری امت مسلمہ کی طرف سے پھر اس موقوف کا اعادہ کرتا ہوں کہ جنگ ہماری ضرورت نہیں ہے جنگ امریکہ اور مغرب کی ضرورت ہے اور پاکستان میں اگر جنگ ضرورت ہے تو ان لوگوں کی جو امریکا کو اپنا اتحادی سمجھتے ہیں۔لہٰذا جنگ کا ماحول تباہی اور بربادی کا ماحول، یہ ماحول ہمارا نہیں بلکہ درحقیقت یہ ماحول آپ کا پیدا کیا ہوا ماحول ہے۔آپ نے تو اشتعال دلایا کچھ لوگ ضرور مشتعل ہوئے، ان کے اشتعال کو تم استعمال کر رہے ہو اور اس کو جواز بنا رہے ہو اور اس بناء پر مدارس کو برباد کر رہے ہو، مذہب اور اسلامی تہذیب کو برباد کر رہے ہو۔

میرے محترم دوستو! دینی مدرسے کے کردار کو کم کرنا اور بالآخر ختم کرنا، یہ بین الاقوامی ایجنڈا ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں 1994ء سے 2004ء تک دینی مدارس کی رجسٹریشن بند کردی گئی تھی، پیپلز پارٹی کی حکومت نے مدارس کی رجسٹریشن پر پابندی لگائی، میاں نواز شریف صاحب کی حکومت میں پابندی برقرار رہی، پرویز مشرف کی حکومت میں 2004ء تک پابندی رہی، اور بالآخر دینی مدارس اور حکومت کے درمیان مذکرات ہوئے۔مذاکرات کے نتیجے میں رجسٹریشن کے ایک نئے قانون پر اتفاق ہوا، اور اس اتفاق رائے میں دینی مدارس کے نصاب تعلیم پر اتفاق ہوا، دینی مدارس کے نظم ونسق پر اتفاق ہوا، دینی مدارس کے مالیاتی نظام پر اتفاق ہوا۔جب ہم ایک بار اتفاق رائے کر چکے ہیں، اس اتفاق کے نتیجے میں ایک متفقہ قرارداد آئی، مرکز میں اس پر قانون سازی ہوئی، چاروں صوبوں میں اس پر قانون سازی ہوچکی۔پھر آئے روز حکومت کی طرف سے ازسرنو دینی مدارس کا سوال کیوں اٹھایا جاتا ہے؟ یہ بنیادی سوال ہے ہمارا، کہ کیوں اس مسئلہ کو بار بار اٹھایا جارہا ہے؟ اس کا معنی یہ ہے کہ ہماری بیوروکریسی کسی کی ایجنٹ بنی ہوئی ہے اس معاملے میں۔ہر حکومت میں اس معاملے کو ایک نئے ایجنڈے میں پیش کردیتی ہے۔اس وجہ سے ہمیں مجبوراً قوم کو صورتحال سے آگاہ کرنا پڑتا ہے۔

تعجب کی بات ہے، یہ لوگ دعویدار ہیں کہ یہ قائداعظم کا پاکستان ہے، بانی پاکستان نے پاکستان کا پہلا پرچم کراچی میں ایک دینی مدرسے کے فاضل کے ہاتھ سے لہروایا، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے پاکستان کا پہلا پرچم لہرایا؛ جس کو انگریز نے ان پڑھ لکھا کیونکہ وہ کسی پرائمری سکول کی سرٹیفکیٹ سے محروم تھا، انگریز نے تو ان کو ان پڑھ لکھا، لیکن بانی پاکستان نے اسی مدرسے کے فاضل کو پاکستان کا جھنڈا ہاتھ میں تھمایا اور پاکستان کا پہلا پرچم ان سے لہروایا۔کراچی میں بھی پاکستان کا پہلا پرچم اسی مدرسے کے فاضل نے لہرایا اور ڈھاکہ میں بھی پاکستان کا پہلا پرچم اسی مدرسے کے ایک اور فاضل نے لہرایا۔بتائیں بانی پاکستان کے وارثو! اگر بانی پاکستان نے پاکستان کے پرچم کو لہرانے کیلئے شیخ الاسلام کا انتخاب کیا اور یہ ان کے نظریئے اور پاکستان کے مستقبل کے بارے میں ان کی سوچ کی اگر تعبیر ہوسکتی ہے۔تو پھر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے پاکستان کو جو تعبیر مہیا کی وہ قرارداد مقاصد تھی، جو آج بھی پاکستان کے آئین کا باقاعدہ حصہ ہے۔تو جس مدرسے نے پاکستان کو اس کی نظریاتی اساس مہیا کی، جس کے فاضل نے پاکستان کا جھنڈا لہرایا، بانی پاکستان کے جانشین آج ان مدارس کی زندگی کو اور ان کے وجود کو ختم کرنے کے درپے کیوں ہیں؟ میں بانی پاکستان کے وارثوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ مغربی ایجنڈے کی بنیاد پر دینی مدارس کے اندر کمزوریاں نکالنے والو! آج تم صحیح ہو یا بانی پاکستان صحیح تھا؟ اسلام کے نام پر پاکستان بنا، میں خود کئی سالوں سے دیکھ رہا ہوں، موجودہ حکومت، اس سے پہلے کی حکومت، اور اس سے پہلے کی حکومت، مسلسل میں پارلیمنٹ میں دیکھ رہا ہوں۔مغربی سوچ کی تخلیق پر مبنی قانون سازی کیلئے بل ایوان میں آتے ہیں، لیکن اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات جو آئین کا تقاضا ہے، 40 سال سے پڑی ہیں، آج تک ایوان میں پیش کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔وہ تو ہمارے ملک کا نظام بنے لیکن اسلامی قانون سازی کیلئے کوئی تیار نہیں ہو رہا۔

کہا جاتا ہے کہ وفاق میں سیاست نہیں ہونی چاہئے، حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا: جو شخص حجرے میں اور مسجد میں قید ہو کر اس خدمت دین کو کافی سمجھتا ہے میں ایسے عالم کو عالم نہیں علماء کے دامن پر کالا داغ سمجھتا ہوں۔حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ایک مضمون میں فرماتے ہیں کہ دین اسلام کے تین موالید ہیں موالید ثلاثہ:تعلیم احکام، تہذیب اخلاق، اور تنظیم اعمال۔تعلیم احکام کو ہم شریعت کا نام دیتے ہیں، تہذیب اخلاق کو ہم طریقت کا نام دیتے ہیں اور تنظیم اعمال کو سیاست کا نام دیتے ہیں۔شریعت راستہ ہے جس پر ہم نے چلنا ہے اور طریقت اس راستے پر چلنے کی قوت حاصل کرنے کا نام ہے۔ان میں ایک علم کی بنیاد پر اور دوسرا تربیت کی بنیاد پر ہے۔اور راستے میں مشکلات آتی ہیں، شریعت پر چلنا کوئی آسان کام نہیں ہے، رب العزت نے سب سے پہلے بنیاد رکھدی: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ ، ہم نے تو انسان کو مشقت میں پیدا کیا اور پھر اسی طرف متوجہ کرنے کیلئے فرمایا فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ جانتے ہو یہ گھاٹی ہے کیا جس میں آپ اتر رہے ہیں؟ شریعت کو تعبیر کیا گھاٹی سے، یعنی اپنی خواہشات سے ناموافق حالات میں اترنا کہ وہاں پر آپ کو ناموافق ہوائیں بھی ملتی ہیں، آپ کو راستے میں پتھر بھی آتے ہیں، پتھریلی زمین بھی آتی ہے، کانٹے بھی آتے ہیں، جھاڑیاں بھی آتی ہیں اور آپ ان مشکلات کو عبور کررہے ہیں۔ان مشکلات کو عبور کرنا اور اس راستے کو اپنانا، اس کیلئے طاقت چاہئے، اور اس راستے کی طاقت سیاسی قوت ہے۔اگر سیاسی قوت نہیں تو پھر حضرت حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ یہ تینوں موالید ثلاثہ ہیں اور ان تینوں میں تلازم ہے کہ ایک کے بغیر دونوں اور دونوں کے بغیر ایک ناقص تصور ہوں گے۔ان میں کمال تب آئے گا جب انسان کے اندر شریعت بھی ہوگی، طریقت بھی ہوگی اور سیاست بھی ہوگی۔حضرت شیخ الہندؒ کو اللہ نے جو فکر دیا انہوں نے پوری دنیا کو مخاطب کیا، ان کی تحریک نے پورے کرہ ارض پر ایک کا پیغام بھیجا اور میرے اکابر نے جو بات کی، پوری انسانیت کے حوالے سے کی۔اس وجہ سے آج ہم ایک موقف پر کھڑے ہیں، اس وجہ سے میں کہتا ہوں کہ:

میں انقلاب پسندوں کے اس قبیل سے ہوں
جو حق پہ ڈٹ گیا اس لشکرِ قلیل سے ہوں
میں یوں ہی دست و گریباں نہیں زمانے سے
میں جس جگہ پہ کھڑا ہوں، کسی دلیل سے ہوں

لہٰذا ہم نے اس مہم کو آگے چلانا ہے اور جاری رکھنا ہے۔لیکن ایک بات آپ سے بھی کہنا چاہتا ہوں۔غیروں پہ تنقید کرنا آسان ہوتا ہے، اپنوں سے بات کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔اگر آپ کی یہ تمام قیادت جو یہاں صف آراء ہے، اس سٹیج سے پوری دنیا کو امن کا پیغام دے رہی ہے اور برملا بار بار اور بار بار ہر فورم سے ہم اس کا اعادہ کرتے چلے آئے ہیں کہ پاکستان میں مسلح جنگ نہیں ہونی چاہئے۔ہر گاہ اس پر اتفاق رہا ہے۔جب ہم یہ پیغام دے رہے ہوں اور میرے مدرسے کا ایک مدرس اپنی درس گاہ میں طلبہ کو اس کے علاوہ کچھ اور کہہ رہا ہو تو پھر انٹیلی جنس ایجنسیاں جب میرے مدرسے کے اندر کی رپورٹ بھیجیں گی اور دوسری طرف ہمارے اس جلسے کی رپورٹ

(باقی صفحہ نمبر 8)

سیٹھ عبدالوہاب مرحوم

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں

ابن محمود ہوشیار پوری

1983-84ء میں جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور کے مرکزی دروازے کے دائیں پہلو میں دارالحدیث ہوا کرتا تھا اسکے بعد حضرت مولانا سید حامد میاںؒ کی خانقاہ، رہایش گاہیں اور مہمان خانے کی سمت جانے کا راستہ، اس راستے کے بائیں پہلو میں جامعہ کا دفتر اور اگلے کمرے میں ہفت روزہ نقیب ملت کا دفتر تھا۔ نقیب ملت کا ڈیکلریشن لنڈا بازار لاہور کے ایک تاجر مولوی ہدایت اللہ کے نام تھا جو مسلکاً غیر مقلد تھے، جمعیۃ علماء نے ان کا رسالہ انہی ماہ وسال میں محدود مدت کیلئے عاریتاً حاصل کیا تھا کہ جنرل ضیاء کی آمریت میں سیاست اور صحافت پابندیوں کا شکار تھی۔ ایسے خوف اور گھٹن کے دور میں جمعیۃ علماء اسلام کیلئے صحافتی ترجمانی کرنے والی ٹیم کے قائد جناب اکرام القادری تھے۔ ہم جمعیۃ طلباء اسلام کے لوگ بھی انہی کے کمرے میں بیٹھ کر ''للّٰہ الامر'' کے نام سے ہر ماہ چند صفحات پر مشتمل ٹریکٹ تیار کیا کرتے تھے۔ جے ٹی آئی کی سرپرست حضرت مولانا سید محمد شاہ امروٹیؒ اور کر ''للّٰہ الامر'' کے نگران محترم محمد ادریس اپل تھے۔

ایک دن راقم السطور جے ٹی آئی کے چند دوستوں کے ہمراہ محترم اکرام القادری کے کمرے سے نکل کر گھر جانے کیلئے جامعہ کے دفتر کے قریب تھا کہ دیکھا حضرت مولانا سید حامد میاںؒ کی خانقاہ کی سمت سے ایک منجھلے قد کے عمر رسیدہ، باریش بزرگ بڑے باوقار انداز سے چلتے ہوئے آرہے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک دراز قامت، متوازن جسامت، قدرے پختہ عمر کے جوان بھی تھے، مودب اور متجسس کیفیت تھی کہ ایک ساتھی بولے یہ سیٹھ نور احمد ہیں اور پیچھے ان کے بیٹے سیٹھ عبدالوہاب۔ یہ شمالی لاہور کے علاقے شاد باغ کا رہائشی احراری خاندان ہے، کپڑے کی تیاری اور تجارت میں اچھی شہرت اور مقام رکھتا ہے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ سیٹھ عبدالوہاب کے چار بہن بھائی بچپن میں فوت ہو گئے اسکے باوجود ماشاء اللہ بارہ پر مشتمل پوری ٹیم ہے۔ یعنی کل 16 تھے۔ والد کی وفات کے بعد سیٹھ عبدالوہاب نے سیٹھ نور احمد ہی کی طرز پر کنبے کو جوڑ کر جمعیۃ علماء اسلام کیساتھ چلایا اور جمعیۃ کا پروگرام آئندہ نسلوں کو منتقل کرنے کا عمل زندگی بھر جاری رکھا۔ شاد باغ میں ان کے گھر ان کے چھوٹے بھائی حافظ راشد رمضان المبارک میں تراویح میں قرآن سناتے ہیں۔ سال کے باقی مہینوں میں مولانا نعیم الدین، قاری ثناء اللہ اور دیگر علماء کے دروس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

یہ سلسلہ کئی سال سے جاری ہے۔ اسکے اثرات یہ ہیں کہ اس گھر کے قرب وجوار میں جمعیۃ علماء اسلام متعارف ہے فضاء فرقہ واریت سے پاک ہے، لوگوں کی ایک بڑی تعداد ایسے باریش اور بارونق چہروں میں بدل چکی ہے جو دین کے جامع تصورات کو سمجھتی ہے، ان پر یقین رکھتی ہے اور عمل پیرا ہے۔ خود سیٹھ عبدالوہاب کی تینوں بچیوں کے شوہر حفاظ ہیں اور ان میں سے ایک باقاعدہ عالم دین ہے جو ذاتی کاروبار کرتے ہیں مگر صبح کے اوقات میں لاہور کے ایک مشہور مدرسہ دارالعلوم اسلامیہ میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔

یہ اپنی نوعیت کا شائد واحد واقعہ ہے کہ جمعیۃ علماء اسلام کیلئے لاہور میں جب بھی ہنگامی فنڈز اکٹھا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی سیٹھ عبدالوہاب کو مالیاتی کمیٹی کا سربراہ بنایا گیا اور پھر انہوں نے خود بھی خوب تعاون کیا اور اپنے سماجی اور معاشی مقام وحیثیت کو ایک طرف رکھ کر بلا جھجک فنڈز جمع کئے۔ راقم الحروف ذاتی طور پر گواہ ہے کہ ڈیڑھ سو سالہ خدمات دارالعلوم دیوبند کانفرنس 2001ء کیلئے سیٹھ عبدالوہاب اور حضرت مولانا محب النبی صاحب ایسے ایسے اشخاص کے پاس گئے جن کے پاس معمول کی زندگی ان میں سے کوئی ایک بھی محض علیک سلیک کیلئے جانا گوارا نہ کرتا۔ چونکہ یہ حضرات جمعیۃ کے کام کو عین دین تصور کرتے ہیں، اسلئے انہوں نے دینی کام کے راستے میں اپنی انا کو رکاوٹ نہیں بننے دیا۔

29 جنوری 2012ء کو لاہور سے قائد جمعیۃ حضرت مولانا فضل الرحمٰن نے ایک کاروان کی قیادت کرتے ہوئے گوجرانوالہ براستہ روڈ جانا تھا، سیٹھ عبدالوہاب رات گئے تک جماعتی احباب کیلئے بڑی اور چھوٹی گاڑیوں کا بندوبست کرتے رہے۔ اپنے انتقال سے ایک سال قبل وہ کینسر جیسی تکلیف دہ اور جان لیوا مرض کا شکار ہوئے، اس مرض نے عمر کے آخری پانچ ماہ میں بہت ستایا۔ مگر سیٹھ عبدالوہاب 31 مارچ 2013ء کی اسلام زندہ باد کانفرنس کے مالی معاملات کیلئے شب وروز سرگرم رہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ روزانہ باقاعدگی سے کانفرنس کیلئے لگائے گئے ضلعی کیمپ آفس میں اپنے بیٹے عدنان کے ہمراہ عصر، مغرب کے دوران آتے اور رات 11 بجے یا بعض اوقات اسکے بھی بعد تک مختلف امور کی انجام دہی کیلئے سرگرداں رہتے۔

سیٹھ عبدالوہابؒ اپنی گراں قدر جماعتی اور دینی خدمات کے باوجود کوئی قومی یا صوبائی سطح پر بڑا اور متعارف نام نہیں تھا مگر اللہ نے ان کو اس حوالے سے خوش قسمت بنایا کہ ان کی دو بڑی خواہشات جس سے ان کی دین دوستی اور فکر آخرت پر یقین کا انداز ہوتا ہے، ان کی آنکھوں کے سامنے پوری کیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے اپنی گرہ سے ڈھائی کنال رقبے پر مشتمل مسجد اور مدرسہ تعمیر کروایا۔ دوسرا یہ کہ ان کا پوتا حسان حافظ قرآن بنا اور اس نے ان کا جنازہ بھی پڑھایا۔ حضرت قائد جمعیۃ سیٹھ عبدالوہاب مرحوم کے پسماندگان سے اظہار افسوس کیلئے بنفس نفیس ان کی رہائش گاہ تشریف لے گئے، حقیقت یہ ہے کہ سیٹھ نور احمد، سیٹھ عبدالوہاب جیسے لوگ اب خال خال ملتے ہیں اور ایسے خاندان تو اب بالکل ہی نایاب ہیں، جن کے بارے میں شاعر نے کہا ہے

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

اللہ کریم سے دلی دعا ہے کہ وہ سیٹھ عبدالوہابؒ اور امت کے تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین ثم آمین، بجاہ النبی الکریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔ (بشکریہ ماہنامہ الجمعیۃ، راولپنڈی)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بقیہ: دینی مدارس ایک بار پھر نشانے پر

پر مدارس دینیہ اور اہل مدارس کو ثانوی درجہ دیتے ہوئے غیر مقبول اور غیر موثر کرنے یا اپنے دائرے میں لپیٹنے کی حتی المقدور کوشش کی۔ حالیہ عشرے ڈیڑھ سے اس نعرے کی گردان کی جارہی ہے کہ دینی مدارس کو ''قومی دھارے'' میں لانا ہے۔ اس ہدفی نعرے کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ریاستی اور حکومتی طاقت اور وسائل کے علاوہ عوام کو غلط معلومات، اعداد وشمار اور تجزیوں کے ذریعے ورغلا کر مدارس کی اعانت اور محبت سے باز رکھنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جارہا ہے۔ تاریخ کے جھروکوں میں جھانکنے سے قبل ہم نے ابتداءً پاکستان کے تعلیمی نظام، نصاب، ماحول اور اس کے اثرات ونتائج سے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ قومی دھارا محض ایک بڑا مسا کستان ہے اور یوں کھربوں روپے کے بجٹ اور طویل وعریض، بلند وبالا عمارات، دفاتر اور صاحب اختیار وحشمت حکام کے مقابلے میں سنجیدگی، نتیجہ خیزی، قوت عمل اور اثرات کے حوالے سے دینی مدارس کی کارکردگی اور خدمات قابل ستائش وتحسین ہیں، مگر ''قومی دھارے'' میں لانے کے نام پر مخالفین انہیں سزا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ (بشکریہ ماہنامہ الجمعیۃ، راولپنڈی)

دینی مدارس ایک بار پھر نشانے پر

حافظ محمد ابوبکر شیخ
ڈپٹی ایڈیٹر ماہنامہ الجمعیۃ راولپنڈی

پاکستان کے نظام تعلیم میں روز اول ہی سے نقائص کی کمی نہ تھی کہ اس کا اجراء دور غلامی کی باقیات کی بیساکھیوں پر ہوا تھا۔ مرورِ زمانہ نے اب اس کو خستہ حالی سے بڑھا کر انہدام اور تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا ہے۔ آج کے پاکستان میں 18 ویں ترمیم کی منظوری کی وجہ سے تعلیم صوبائی حکومتوں کے دائرہ اختیار میں ہے۔ حجم کے اختصار اور کام کی تقسیم کے باوجود بھی اہل پاکستان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے یہ نظام ناکافی، غیر موثر، بے مقصدیت اور وقت کے ضیاع منبع بن چکا ہے۔ صورتحال کچھ یوں ہے کہ کہیں سکول وکالج ہیں، معلم اور متعلم نہیں ہیں۔ کہیں معلم اور متعلم ہیں مگران کے درمیان مطلوب تناسب موجود نہیں۔ کہیں یہ دونوں متوازن ہیں مگر سکول کی عمارت موجود نہیں یا مخدوش ہے۔ ایسی درسگاہوں کی بھی کمی نہیں جہاں فرنیچر، فکسچر اور تجربہ گاہیں نہیں ہیں اور کارکردگی کے ترازو میں ان کے نتائج واثرات کا پلڑا خالی ہے۔ بعض جگہوں پر سرے سے سکولز ہی موجود نہیں، محض کاغذات کی سیاہی سے فائلوں کے بھرے ہوئے پیٹ پر ناسور نما شخصیات اور محکمہ تعلیم کے قوم فروش کارندے حرام خوری میں مشغول ہیں۔ اگر کہیں محض اتفاق سے مطلوب عناصر موجود ہیں تو وہاں توجہ، محنت اور اوقات کار میں ہیر پھیر کی وجہ سے نتیجہ خیزی ناپید ہے۔ محکمہ تعلیم کے انتہائی بالائی سطح کے مجاز افسران، وزارت تعلیم اور حکومتیں مل کر ہر پانچ سات سال بعد تعلیمی، تدریسی یا نصابی زاویہ تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ عمل معمولی درجہ کی نتیجہ خیزی کی طرف پیش قدمی کی بھی بریک لگا دیتا ہے۔ مزید یہ کہ ایسا کوئی نظام تربیت یا طریقہ روبہ عمل نہیں ہے جو نونہالان وطن کے فطری، طبعی رجحانات سے مطابقت کی حامل تعلیم، اس کی معاون اور مددگار سرگرمیوں سے بچوں کی راہنمائی کر سکے۔ سرکاری تعلیمی نظام کے متوازی نجی کاروباری طور پر قائم نظام تعلیم، تفاوتِ درجات اور اخراجات کے ساتھ موجود ہے۔ ان کا ابتدائی درجات کیلئے نصاب شتر بے مہار، ثانوی اور اعلیٰ درجات کیلئے غیر ممالک کے نظام ہائے تعلیم کا پروردہ ہے اور ماحول مکمل طور پر مقامی، غیر روایتی اور غیر اسلامی ہے۔

تاریخ کے اوراق الٹئے اور ماضی کے جھروکوں سے جھانکئے۔ برصغیر میں تیرہویں صدی ہجری کی رخصتی کے ساتھ عظیم مغلیہ سلطنت اور اسلامی شوکت کے چراغ گل ہو رہے تھے، 1857ء کے جہاد آزادی کا نتیجہ تمام تر قربانیوں کے باوجود ناکامی کی صورت میں ظہور پذیر ہو چکا تھا، مسلط بدیشی حکمران برصغیر سے علمی مراکز اور علمی خانوادوں کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کا فیصلہ کر چکے تھے، اندلس کی تاریخ کو برصغیر میں دہرانے کا عزم ظاہر ہو چکا تھا کہ خدا رسیدہ بزرگوں اور اولیائے وقت کی ایک جماعت نے اپنی قلبی وارداتوں پر مشتمل مذاکرے کے نتیجے میں مسلمانان برصغیر کی حفاظت، آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کیلئے ایک نئی طرز کو اپناتے ہوئے علوم نبویہ کی ایک درسگاہ قائم کی تاکہ دینی معاشرتی اور تمدنی زندگی کا رشتہ اسلامی قالب سے استوار رہے۔ غلام برصغیر میں دین اسلام اور انسانیت کی بقاء و فلاح کا یہ مخلصانہ منصوبہ عنداللہ انتہائی مقبول ہوا کہ تعلیمی اجتماعیت، فکری وحدت اور تاریخی تسلسل کے سوتے یہیں پھوٹے۔ اس منصوبے کے تحت دین، شعائر دین کی حفاظت عمل میں آئی، برصغیر کے چپے چپے پر مدارس دینیہ کے اہتمام، انتظام اور انصرام کا ایک نظم قائم ہوا جو اپنی مثال آپ بنا۔ ان مدارس نے مساجد کیلئے خدام، امام، خطیب تیار کئے۔ مکاتیب قرآنیہ کیلئے مدرس، وعظ و تلقین کیلئے مقرر اور دعوت و تبلیغ کے لئے داعی تیار کئے۔ حریت و آزادی اور استخلاص وطن کیلئے جانفروشوں کی ایک بڑی تعداد کی تعلیم و تربیت انہی مدارس سے ہوئی، علم کی ثقہ روایت، عمل کے ماضی سے مربوط و مستحکم مثال انہی مدارس کے فضلاء بنے۔ تا آنکہ تقسیم برصغیر کا ظہور ہوا، اسلامی نظریئے اور نعرے پر پاکستان کے نام سے ہمارا وطن قائم ہوا، جس کی بنیادوں میں قربانیوں کی ایک بڑی اور حیران کن کہانی موجود ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک کے 68 سالوں میں مدارس دینیہ اپنے جد امجد دارالعلوم دیوبند اور اس کے بانی قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے اصول ہشتگانہ کی روشنی میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ فرنگی سامراج کے برصغیر سے جانے کے بعد کے عرصے میں انہی کے سدھائے ہوئے، انہی کی بود و باش، وضع قطع کے حامل جن مقامی خواتین و حضرات نے مملکت کی باگ ڈور سنبھال رکھی ہے انہوں نے مدارس دینیہ اور ان کے جملہ متعلقین کو اختیار و اقتدار کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا۔ سماجی اور سرکاری سطح (باقی صفحہ نمبر 7)

بقیہ: دینی مدارس اسلامی تہذیب کے پشتی بان

بھیجیں گی تو تضاد نہیں ہوگا؟ یہ وطیرہ ٹھیک نہیں ہے کہ میں تو کچھ کہتا رہوں اور میرے مدرسے کا استاد طلبہ سے کہے کہ یہ سیاسی لوگ ہیں اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں لیکن ہم نے یہی کام جاری رکھنا ہے تو پھر تضاد بھی آئے گا اور مشکلات بھی ہوں گی۔

مولانا سمیع الحق صاحب یہاں تشریف فرما ہیں، میں دارالعلوم حقانیہ میں آٹھ سال پڑھا ہوں، مفتی غلام الرحمٰن صاحب میرے ہم سبق ہیں۔ ایک مرحلہ وہ بھی آیا جب مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ کچھ قوتوں کے ارادے دارالعلوم کے لئے برے ہیں تو میں نے سب سے پہلے حضرت مولانا کو آگاہ کیا، مولانا فکرمند بھی ہوئے اور پھر ایک مرحلہ آیا جب میں نے مقتدر قوتوں کو پیغام بھیجا کہ اگر دارالعلوم حقانیہ کی طرف آپ نے ٹیڑھی آنکھ سے دیکھا یا اس کے خلاف کوئی اقدام کرنے کی کوشش کی، تو فضل الرحمٰن سمیع الحق کا سپاہی بن کر دارالعلوم حقانیہ کا دفاع کرے گا۔

میرے محترم دوستو! مسئلہ صرف جمعیت کا نہیں ہے، مسئلہ امت مسلمہ کا ہے۔ مسئلہ ہمارے ہر دینی ادارے کا ہے، ہمارے جامع اور ہمہ گیر دینی کاز کا ہے۔ اس میں ہمارے چھوٹے چھوٹے اختلافات اور گروہ بندیوں کی گنجائش نہیں ہے، میں الحمدللہ ثم الحمدللہ اپنے اس فرض کو سمجھتا ہوں، اور اس حوالے سے اپنے تمام اداروں کے ساتھ رابطے میں بھی ہوں۔ یہ ہمارا میدان ہے، ان شاءاللہ العزیز اس میدان کو ہم نے خالی نہیں چھوڑنا، ہمتیں نہیں ہارنی۔ کام ہو رہا ہے، جماعتی تشکیل ہو رہی ہیں، گلی گلی کوچے کوچے جا رہی ہیں، مسجد کی طرف آنے کی دعوت دی جا رہی ہے، یہ بھی تو ایک مشن ہے اور وہ بھی ایک مشن ہے کہ این جی اوز کی تشکیلیں ہو رہی ہیں، گلی گلی کوچے کوچے جا رہی ہیں اور خدا جانے کس کس نام پر ہمارے گھروں میں ہماری نئی نسل کو گمراہ کر رہی ہیں، یہ ہماری تہذیب کے خلاف ایک مشن ہے۔ اور یہ تہذیبی حملہ اس وقت آپ کے صوبے پر کیا جا رہا ہے جہاں مذہب کی جڑیں گہری ہیں۔ اس حساسیت کو کوئی سمجھنے کوشش کرے۔ اس کی طرف آپ کو متوجہ کرنے کیلئے آپ کو یہاں آنے کی تکلیف دی گئی ہے۔ اور میں وفاق المدارس کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس ساری صورتحال کو سمجھا، اور علماء کرام کو یکجا کر کے انہیں متوجہ کرنے کی یہ کوشش کی۔ اللہ تعالی ان کی کوششوں کو بار آور ثابت فرمائے اور میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ مدرسہ اسی طرح رہے گا، اسی طرح رہے گا، کسی کا باپ بھی مدرسے کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ ان شاءاللہ العزیز۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین۔

(بشکریہ ماہنامہ الجمعیۃ، راولپنڈی)